تختۂ سیاہ پر سفید چاک کا نشان: منٹو

ڈاکٹر فیاض عالم

مکان نمبر: L19/A سیکنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025، موبائل: 9818356471

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کا نابغۂ روزگار افسانہ نگار ہے جس کی نظر معاشرے میں رائج ان تمام مسائل پر تھی جو معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لے جانے کے ذمہ دار تھے۔ منٹو نے معاشرے کے ایسے ہی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے فن کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے معاشرے میں رائج برائیوں کو اس کی اصل شکل میں پیش کیا ہے اور ایک محقق کی طرح ان مسائل کی بنیاد میں جا کر ان کی وجوہات تلاش کی ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو کا انداز بیان حقیقت پسندانہ ہے۔ ان کا رویہ کبھی کبھی بہت تلخ بھی ہو جاتا ہے اور انداز بیان کی اسی تلخی کے باعث انھیں معاشرے کے سفید پوش جغادریوں کی سازشوں کا شکار بھی ہونا پڑا۔ منٹو سے لوگوں کی ناراضگی کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے جان بوجھ کر ایسے مسائل کو موضوع بنایا جن پر اس سے قبل کچھ لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ منٹو نے سماج کے نام نہاد سفید پوش افراد کی سچی تصویر اپنے کرداروں کے ذریعہ پیش کر دی اور اپنے افسانوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سماج میں جو برائیاں رائج ہیں ان کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں جو شرافت کا لبادہ اوڑھ کر گھناؤنی حرکتیں کرتے ہیں۔ منٹو ایسے ہی لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو سماج، معاشرہ، مذہب، رسم و رواج وغیرہ کا حوالہ دے کر لوگوں کی ناداری، مجبوری اور بے بسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ منٹو نے مختلف سماجی برائیوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں افسانوں کا موضوع بنایا اور معاشرے کی خرابیوں کو من وعن الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اس کے متعلق وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کہاں اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں، لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور زیادہ نمایاں ہو جائے، یہ میرا خاص انداز میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور نہ معلوم کیا کیا کچھ کہا جاتا ہے، لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر کمبخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی۔''

منٹو کا تعلق جس دور سے ہے وہ عالمی تناظر میں بحران اور انحطاط کا دور تھا جس کے تحت پوری دنیا کے ممالک الگ الگ مسائل سے نبرد آزما تھے۔ عالمی تناظر میں جہاں عالمی جنگ عظیم کے بعد کی تباہی و بربادی، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملے نے پوری دنیا کے عوام کو بھوک، افلاس، بیماری اور بے سروسامانی میں مبتلا کر دیا تو وہیں دوسری طرف ہندوستانی پس منظر میں انگریزوں کے مظالم، قحط بنگال، زمینداروں اور مہاجنوں کے استحصالی رویے، تقسیم ملک اور اس کے باعث فرقہ واریت کا عروج، نسلی تصادم، مہاجروں کے مسائل، خواتین پر ظلم و جبر اور کسانوں او رسرمایہ داروں کے درمیان کش مکش میں اضافہ وغیرہ ایسے مسائل تھے جو کسی بھی حساس ادیب کی ذہنی بے چینی کو بڑھانے کے لیے کافی تھے۔ ادب اپنے گردوپیش کے حالات کا عکاس ہوتا ہے اور ادیب اپنے عہد کا مصور۔ چونکہ منٹو حساس ذہن کے مالک تھے ایسے میں ان کا ان تمام حالات سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا جن کی عکاسی ان کے افسانوں میں دانستہ اور نادانستہ طور پر بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بذات خود منٹو بھی کسی نہ کسی سطح پر ان مسائل سے دوچار ہوئے۔ تقسیم ہند و پاک عالمی نقشے اور تاریخ کی سب سے بڑی تقسیم تھی جس میں کروڑوں افراد نقلِ مکانی پر مجبور ہوئے اور ان کی مجبوری کا فائدہ جس طرح فرقہ پرستوں نے اٹھایا اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔ سعادت حسن منٹو بھی ان فرقہ پرستوں کا نشانہ بنے اور انھیں بھی تقسیم ملک کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی بمبئی چھوڑ کر کراچی (پاکستان) ہجرت کرنا پڑا۔ منٹو پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس ملک میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں جینا اور مرنا چاہتے تھے، لیکن فرقہ پرستوں نے جس طور سے بمبئی ٹاکیز کے مالک کو مسلمانوں کو کمپنی سے نکالنے کی دھمکی دی اس کی وجہ سے مجبوراً انھیں سامان سفر باندھنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک بمبئی اور وہاں پر گزاری گئی

اپنی زندگی کو بھول نہیں پائے۔ تقسیم ملک کے اس وقت کی صورتحال کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

''۱۴/اگست کا دن میرے سامنے بمبئی میں منایا گیا۔ پاکستان اور بھارت دونوں آزاد ملک قرار دیے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے، مگر قتل اور آگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگریس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور قائداعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں پر گونجتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان۔''

(گنجے فرشتے، ص:۲۰۰)

تقسیم ملک کے باعث ملک میں اخوت اور بھائی چارے کا کال پڑ گیا۔ عام لوگ بڑی تعداد میں مذہبی جنون کا شکار ہونے لگے۔ تمام مذاہب کے پیروکار رواداری کے راستے کو ترک کر کے نفرت اور تعصب کے راستے پر چلنے لگے۔ ان تمام حالات کے ذمہ دار ملک کے مفاد پرست سیاستداں اور نام نہاد مذہبی ٹھیکیدار تھے۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں ایسے ہی لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ اس کی وضاحت اس اقتباس سے ہو جاتی ہے جس میں وہ ملک سے ختم ہوتی ہوئی انسانیت کے متعلق سوال کرتے ہیں:

''اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیل اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے..... ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ کیسے مر رہے تھے۔ کیوں مر رہے تھے۔ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے بھارتی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا، مگر اس سوال میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو کوئی کہتا انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا، کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لیے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہنستے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے۔ جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا یا پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا، لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، حیوانیت و بربریت کا غلام۔''

اسی طرح ہندوستان کی تقسیم کے بعد فرقہ پرستوں نے جس طرح انسانی خون سے ہولی کھیلی، معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ خواتین کی عصمت کو تار تار کیا۔ صدیوں سے ساتھ رہ رہے لوگ ایک دوسرے کی عزت و آبرو اور جان و مال کے دشمن ہو گئے۔ مذہبی جنونیوں نے دل دہلا دینے والے انسانیت سوز مظالم کیے۔ انسانیت، اخوت اور بھائی چارہ سب کچھ ختم کر کے لوگ مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ اس کے متعلق منٹو ''خالی ڈبے خالی بوتلیں'' میں لکھتے ہیں:

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ مسلمان اور ایک لاکھ ہندو مرے۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا۔ لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بیوقوف ہیں جو سمجھتے ہیں:

بندوقوں سے مذہب شکار کیا جا سکتا ہے۔ مذہب دین ایمان، دھرم، یقین، عقیدت یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ جو چھرے چاقو یا گولی سے فنا نہیں ہو سکتا ہے؟''

(خالی بوتلیں خالی ڈبے، ص:۴۵۲)

منٹو نے تقسیم کے بعد کی تباہ کاری کو اپنے افسانوی مجموعے ''سیاہ حاشیے'' میں خصوصی طور سے موضوع بنایا ہے۔ تقسیم ملک اور اس سے پیدا شدہ صورتحال سے متعلق انھوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

''منٹو نے فساد کی ننگی تصویر کو وہی لباس پہنایا ہے جو ہمارے حکمراں پہنانا چاہتے ہیں۔ ان حکمرانوں کا یہ کہنا ہے کہ فساد کا تعلق ہندوستان کے سرمایہ دار، جاگیردار، دیش بھگت اور سامراجی ایجنٹوں سے نہ تھا۔ یہ ہندوستانی اقوام کی بربریت ان کی قاتلانہ جبلت اور قدیم عصبیتوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کپڑا جو ہمارے حکمراں فساد کی لاش پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ منٹو نے ایک چابک دست درزی کی طرح اس کپڑے کی کتر بیونت کر کے ایک خوبصورت لباس میں پیش کیا ہے۔''

(ممتاز حسین، نقد حیات، ص:۱۸۳)

منٹو نے فسادات سے متعلق جو بھی افسانے لکھے ان میں عام انسان کو زندگی اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا اور ان اسباب و عوامل پر روشنی

ڈالنے کی کوشش کی جو امن وسکون کے درہم برہم ہونے اور مشترکہ تہذیب کا شیرازہ بکھیرنے کے ذمہ دار تھے۔

منٹو کی زندگی میں دو اہم ادبی واقعات رونما ہوئے۔ ایک تو ۱۹۳۵ء میں انگارے کی اشاعت اور پھر ۱۹۳۶ء میں پریم چند کی صدارت میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس۔ یہ وہ دور تھا جب فاشسٹ طاقتیں پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لینے پر آمادہ تھیں۔ اس دور میں دوسری عالمی جنگ کا ماحول تیار ہو رہا تھا۔ منٹو کی پہلی کہانی ''تماشا'' میں آنے والے دنوں کی تصویر دکھائی دینے لگی تھی۔

تقسیم ملک سے متعلق افسانوں کو منٹو نے دستاویزی شکل دے دی ہے اور تقسیم کو ۱۹۴۷ء کے مکمل پس منظر میں تمام اسباب وعوامل کے ساتھ پیش کیا ہے جن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، سہائے، گورمکھ سنگھ کی وصیّت اور کھول دو جیسے کئی افسانوں میں تقسیم کے بعد شروع ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، انسانیت کی پامالی، وحشی پن اور ہجرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ان میں ایک طرف انسانیت کی پامالی کا کرب ہے تو دوسری طرف انسانیت کی بقا کے لیے جنگ۔ ''گرمکھ سنگھ کی وصیت'' میں گرمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوک سنگھ اپنے باپ کی وصیّت کی تکمیل کے لیے میاں عبدالحئی کے گھر سیوئی پہنچانے جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرقہ پرست عناصر حیوانیت کا ننگا ناچ کر رہے ہیں، اس کی جان کو خطرہ لاحق ہے، لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتا اور اپنے باپ کی وصیّت پوری کرتا ہے۔ وہیں دوسری طرف سہائے فساد میں زخمی ہونے کے باوجود بھی پاکستان جا رہی ایک مسلم طوائف کو اس کا زیور اس کے حوالے کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

منٹو اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جس نے اپنے افسانوں میں ایک نئی دنیا کی بازیافت کی اور ساتھ ہی اس نئی دنیا کے تمام تلخ حقائق سے پردہ ہٹایا۔ اپنے اس بے باک اندازِ بیان کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنازعات کا شکار رہے۔ منٹو نے خیالی اور طلسماتی دنیا کی جگہ سماج کیا ہم مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں کے کردار سوٹ بوٹ اور ہائی پروفائل سوسائٹی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کا تعلق سماج کے متوسط، نچلے اور ایسے طبقے سے ہے جو دو وقت کی روٹی کے محتاج ہیں۔ ایسے لوگوں کی پوری زندگی تلاش رزق اور حصول رزق میں گزر جاتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں طوائف، دلال، فلم ایکٹرس، فقیر، مزدور، تانگے والا، شرابی، پاگل، اوباش، چور، غنڈہ اور فرقہ پرست مختلف قسم کے کردار نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی سطح پر معاشرے کی تصویر بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

منٹو نے ان کرداروں کو ان کی تمام بشری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کردار فرشتہ صفت نہیں ہیں۔ وہ انسان کے مرتبے کو فرشتے پر فوقیت دیتے ہیں۔ منٹو کا ایک اور کمال یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے زیادہ تر کرداروں میں نظریاتی شدت بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہ کردار نیکی اور بدی دونوں کے بیچ کے راستے پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے منفی کرداروں کے یہاں بھی ایک مثبت رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ خصوصاً ان کے افسانوں کے نسوانی کردار جہاں اپنی مجبوری، تنگ دستی اور بے چارگی کے باعث اپنے جسم کا سودا کرنے پر مجبور ہیں وہیں دوسری طرف مذہبی عقائد کے سلسلے میں بھی پابند نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں ہندو نسوانی کردار اپنے کمرے میں ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویر لگا کر اپنی مذہبی عقیدت کا ثبوت پیش کرتی ہیں وہیں دوسری طرف مسلم نسوانی کردار بھی رمضان اور محرم جیسے تہواروں کو عقیدت سے مناتی نظر آتی ہیں جس کی عمدہ مثال ''ہتک'' کی سوگندھی اور ''کالی شلوار'' کی سلطانہ ہیں۔

منٹو کے افسانوں کے کردار زندہ دل، متحرک، بے باک اور بلند خیال ہیں جو اپنی حرکت وعمل کے ذریعہ اس دنیا کی جیتی جاگتی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی بندھے ٹکے دائرے، مذہب اور علاقہ وغیرہ سے نہیں ہے۔ وہ تمام حدود سے پرے اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ منٹو کے کردار الگ الگ مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہتک کی سوگندھی ہندو، کالی شلوار کی سلطانہ مسلمان، ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، (بشن سنگھ) سکھ، ممی کی ممی عیسائی اور موذیل کی موذیل یہودی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں کچھ ایسے بھی کردار ہیں جن کا کسی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ ''سڑک کے کنارے'' کی عورت صرف اور صرف عورت ہے جس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ صرف حوا کی بیٹی ہے اور غریبی اور لاچاری کی پیداوار۔ منٹو کے افسانوں میں مختلف مذاہب کے کرداروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔

منٹو کی تخلیقات انسان دوستی کا مظہر ہیں جہاں ذات پات، مذہب، ملک، رنگ، نسل اور سرحد جیسی تمام چیزیں بے معنی ہیں۔ اگر یہاں وہ کسی چیز کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں تو وہ ہے انسانیت، انسان دوستی اور انسانیت کی بقا۔ منٹو کے زیادہ تر افسانے اسی نہج پر چلتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں اس کی تکمیل کے لیے بعض اوقات جارحانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جو بہت حد تک وقت کی ضرورت بھی تھی۔ منٹو کی نظر میں گہرائی اور گیرائی دونوں ہے۔ ان کی سیاست معاشرت، دین، مذہب،

اخلاق، معاشرہ وغیرہ تمام چیزوں پر اچھی نظر ہے۔منٹو کی نظر حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔اپنے افسانوں کے موضوعات کے متعلق ادب جدید میں وہ لکھتے ہیں:

''زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔میری تحریروں میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔''

(نہ اب ہم ساتھ سیر گل کریں گے، کشمیری لال ذاکر، ص:۲۸)

منٹو نے اپنے افسانوں میں دنیا کو بغیر کسی مصنوعیت کے اسی شکل میں پیش کیا جس شکل میں وہ ہے اور یہی وہ بنیادی عنصر تھا جس کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے الزامات لگے اور انھیں عدالتوں کے چکر لگانے پڑے۔سب سے افسوسناک امر تو یہ ہے کہ منٹو نے جتنے عمدہ افسانے لکھے ان پر اتنے ہی گھناؤنے الزامات عائد کیے گئے۔ان پر مقدمات چلے۔ انھیں پاگل قرار دیا گیا۔اس کے باوجود وہ ثابت قدم رہے اور بغیر کسی خوف وخطر کے اپنا کام کرتے رہے۔سماج میں ہنگامہ ہوتا رہا، لوگ تلملاتے رہے اور وہ بغیر کسی کی پروا کیے آگے بڑھتے رہے۔منٹو نے حکومت اور حکمراں طبقے کو بھی اس کی غلط پالیسیوں کے باعث اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔سماج کے نام نہاد مذہبی رہنماؤں کے متعلق وہ دستاویز میں لکھتے ہیں:

''ہماری حکومت ملاؤں کو بھی خوش رکھنا چاہتی ہے اور شرابیوں کو بھی۔مزے کی بات یہ ہے کہ شرابیوں میں کئی ملا موجود ہیں اور ملاؤں میں اکثر شرابی۔''

منٹو کا یہ خیال تھا کہ انسان تہذیبیں بناتا ہے اور تہذیبیں انسان بناتی ہیں۔ان دونوں کا باہمی تعامل اگر ٹکراؤ کی صورت اختیار کرتا ہے تو تخریبی عمل شروع ہو جاتا ہے۔دائرۂ تہذیب میں شامل ہوئے بغیر کوئی انسان انسان نہیں رہ سکتا۔اور اب اگر کوئی کرتا ہے تو معاشرہ میں اس کا شمار وحشی کے طور پر ہوتا ہے۔منٹو نے اپنے افسانوں میں سماج کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ان کی حقیقت نگاری کے متعلق سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''منٹو کو اس کی حقیقت نگاری اس کی نفسیاتی موشگافی اس کی دور بین و دور رس نگاہ اس کی جرأت آمیز اور بے گانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ، لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزیدار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے اور سیاسی، مذہبی معاشرتی اور سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے۔اس پر اسے مطعون کیا گیا ہے اور اس داد و تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے۔''

(منٹو کا فن، سید وقار عظیم، ص:۱)

منٹو نے جو کچھ لکھا وہ بلا خوف وخطر لکھا۔خواہ وہ مذہب ہو سیاست ہو سماجیات یا کچھ اور۔انھوں نے اپنی بات کو قاری تک پہنچانے کے لیے جو طریقۂ کار اپنایا وہ دیگر افسانہ نگاروں سے الگ تھا۔انھوں نے انسانی فطرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے موضوعات کا تعین کیا جو اردو ادب کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔خصوصی طور پر طوائفوں کی زندگی پر اس بے باکی سے قلم اٹھانے کا سہرا بھی منٹو کے ہی سر جاتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے لیے جس طرح کے کرداروں کا انتخاب کیا ہے انہی کے لحاظ سے زبان بھی استعمال کی ہے اور مکالمے بھی تحریر کیے ہیں۔ان کے کردار عام بول چال کی زبان بولتے ہیں۔اسلوب کی روانی اور بیساختگی کہانی کی دلکشی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

کفایت لفظی منٹو کے اسلوب بیان کی ایک نمایاں خوبی ہے۔کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دینے کا ہنر منٹو کو خوب آتا ہے۔انھوں نے موقع و محل کے اعتبار سے اصطلاحات، تشبیہات اور محاورات کے ذریعہ مکالمے کو مؤثر بنایا ہے۔دلکش تشبیہات کی مثال مندرجہ ذیل اقتباسات میں ملاحظہ ہو:

''اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔'' (شوشو)

''وہ بڑی خوفناک عورت تھی اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیمونچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے۔'' (پہچان)

''وہ کرسی پر اس انداز میں اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔'' (سجدہ)

مذکورہ بالا تشبیہات اردو فکشن کے روایتی Trend سے ہٹ کر ہیں جو ایک وسیع پس منظر کی تصویر کو بخوبی اجاگر کرتے ہیں۔منٹو کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کی شروعات بے حد دلچسپ انداز میں کرتے ہیں اور ان میں آخر آخر تک تجسس باقی رہتا ہے۔اس کے لیے وہ شروع سے آخر تک تمام واقعات کو ایک کڑی سے باندھ کر رکھتے ہیں۔اس سے تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط رہتے ہیں اور روانی

بھی برقرار رہتی ہے۔ اس ضمن میں منٹو کے افسانوں کی تمہید کا بھی خاصا دخل ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ بہت حد تک پوری کہانی کے لیے تجسس پیدا کر دیتے ہیں اور ایک ایسا ماحول تیار کرتے ہیں جو قاری کو پورا افسانہ پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کا اختتام بھی عموماً چونکانے والا ہوتا ہے۔ کھول دو، ٹھنڈا گوشت، مد بھائی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹیٹوال کا کتا وغیرہ افسانے اس کی بہترین مثال ہیں۔

منٹو کے زیادہ تر افسانے اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ منٹو ذات پات، مذہب، ملک اور علاقہ کے حصار میں مقید نہیں ہیں۔ وہ پوری دنیا کے انسانوں کے دکھ درد کا مداوا تلاش کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ حقوق انسانی اور انسانی اقدار کی بقا کی آواز بلند کرتے ہیں۔ وہ نہ مسلمان ہیں نہ ہندو، نہ پنجابی اور نہ کشمیری، وہ صرف ایک انسان ہیں جو معاشرے کو جڑ سے کھوکھلا کرنے والی ہر برائی کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ منٹو کی اس بے باکی کا ثبوت انکل سام کو لکھا گیا خط ہے جس میں وہ امریکہ کو اس کی غلط پالیسی کی وجہ سے طنز کا نشانہ بناتے ہیں:

''ہماری بسیں امریکی اوزاروں سے لیس ہوں گی، ہمارے اسلامک پائجامے امریکی مشینوں سے سلے جائیں گے، ہمارا مٹی کا ڈھیلا امریکی مٹی سے بنا ہوگا جسے ہاتھ سے کسی نے نہیں چھوا ہوگا، قرآن کو رکھنے والے فولڈنگ اسٹینڈ امریکی ہوں گے اور نماز پڑھنے کی چٹائیاں بھی امریکی ہوں گی۔ دیکھتے جاؤ بچا سب تمہاری شان میں قصیدے پڑھیں گے۔''

(انکل سام کے نام خط)

اس اقتباس میں وہ امریکہ کے استحصالی نظریے اور برصغیر میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی دخل اندازی اور امریکہ کو خوش کرنے کے لیے برصغیر کی حکومتوں کے ذریعہ بنائی جارہی پالیسی، عالمی بازار میں امریکی سامان کی خریداری میں اضافہ اور پاکستان میں پیدا ہورہی امریکہ پرستی کے جنون پر زبردست طنز ہے۔

منٹو اردو ادب کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا افسانہ نگار ہے جس کے متعلق شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ ''وہ مومن کی طرح سوچتا ہے اور کافر کی طرح لکھتا ہے۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے وقت سے بہت آگے سوچتا تھا۔ اس کے افسانے اس کے شاہد ہیں۔ منٹو کے کئی کردار مثلاً ٹوبہ ٹیک سنگھ کا بشن سنگھ، کالی شلوار کی سلطانہ، ہتک کی سوگندھی، نیا قانون کا منگو کوچوان، کھول دو کی سکینہ اور بابو گوپی ناتھ کے گوپی ناتھ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ تمام کردار اردو فکشن کے ساتھ لازم وملزوم ہوگئے ہیں۔ اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر جب تک یہ کردار زندہ رہیں گے تب تک منٹو زندہ رہے گا۔ کسی بھی ادیب کے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

منٹو کے ۱۸؍جنوری ۱۹۵۵ء کو تحریر کردہ اس کے کتبے کے ساتھ اپنی بات ختم کررہا ہوں جسے سعادت حسن منٹو نے اپنی موت سے تقریباً ایک سال پہلے لکھا تھا:

''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فن افسانہ نگاری کے سارے اسرار ورموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟''

○○

مونوگراف حضرت وارث شاہ

وارث شاہ جنھیں بجا طور پر پنجابی زبان، پنجابی شاعری اور پنجابی ثقافت، تہذیب وتمدن کا وارث کہا جاتا ہے، ان پر یہ مونوگراف بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں وارث شاہ کے حالاتِ زندگی بھی بھرپور تحقیق وتوجہ کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ ہیر رانجھا کی کہانی کو اسی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس میں وارث شاہ نے اسے تحریر کیا تھا تاکہ اس عظیم شاعر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔

مصنف: رتن سنگھ، صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۴۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی